تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾
وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ
لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ

جانو۔[۱۶] اللہ تمہارے گناہ معاف کردے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔[۱۷] اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، وہ بھی تمہیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہوجانے والی فتح۔[۱۸] اے نبیؐ، اہلِ ایمان کو اِس کی بشارت دے دو۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے مددگار بنو، جس طرح عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے حواریوں[۱۹] کو خطاب کرکے کہا تھا: ''کون ہے اللہ کی طرف (بلانے) میں میرا مددگار؟'' اور حواریوں نے جواب دیا تھا: ''ہم ہیں اللہ کے مددگار۔''[۲۰]

[۱۶] یعنی یہ تجارت تمہارے لیے دنیا کی تجارتوں سے زیادہ بہتر ہے۔

[۱۷] یہ اس تجارت کے اصل فوائد ہیں جو آخرت کی ابدی زندگی میں حاصل ہوں گے۔ ایک، خدا کے عذاب سے محفوظ رہنا۔ دوسرے، گناہوں کی معافی، تیسرے، خدا کی اُس جنت میں داخل ہونا جس کی نعمتیں لازوال ہیں۔

[۱۸] دنیا میں فتح و کامرانی بھی اگرچہ اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، لیکن مومن کے لیے اصل اہمیت کی چیز یہ نہیں ہے بلکہ آخرت کی کامیابی ہے۔ اسی لیے جو نتیجہ دنیا کی اِس زندگی میں حاصل ہونے والا ہے اُس کا ذکر بعد میں کیا گیا، اور جو نتیجہ آخرت میں رُونما ہونے والا ہے اس کے ذکر کو مقدم رکھا گیا۔

[۱۹] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کے لیے بائبل میں عموماً لفظ ''شاگرد'' استعمال کیا گیا ہے، لیکن بعد میں ان کے لیے ''رسول'' (Apostles) کی اصطلاح عیسائیوں میں رائج ہوگئی، اِس معنی میں نہیں کہ وہ خدا کے رسول تھے، بلکہ اِس معنی میں کہ حضرت عیسیٰ ان کو اپنی طرف سے مبلغ بنا کر اطرافِ فلسطین میں بھیجا کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں یہ لفظ پہلے سے اُن لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا جو ہیکل کے لیے چندہ جمع کرنے بھیجے جاتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کی اصطلاح ''حواری'' اِن دونوں مسیحی اصطلاحوں سے بہتر ہے۔ اس لفظ کی اصل حور ہے جس کے معنی سفیدی کے ہیں۔ دھوبی کو حواری کہتے ہیں کیونکہ وہ کپڑے دھو کر سفید کردیتا ہے۔ خالص اور بے آمیز چیز کو بھی حواری کہا جاتا ہے۔ جس آٹے کو چھان کر بھوسی نکال دی گئی ہو اسے حُوارِیٰ کہتے ہیں۔ اسی معنی میں خالص دوست اور بے غرض حامی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ابن سیدہ کہتا ہے ''ہر وہ شخص جو کسی کی مدد کرنے میں مبالغہ کرے وہ اس کا حواری ہے'' (لسان العرب)

[۲۰] یہ آخری مقام ہے جہاں قرآن مجید میں ان لوگوں کو اللہ کا مددگار کہا گیا ہے جو خلق خدا کو دین کی طرف بلانے اور اللہ کے دین کو کفر کے مقابلے میں غالب کرنے کی جدوجہد کریں۔ اس سے پہلے یہی مضمون سورۂ آل عمران، آیت ۵۲، سورۂ حج، آیت ۴۰،

اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ
ع ۲ ۵ ۱۰ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ ﴿۱۴﴾ ع

اُس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے۔ع[۲۱]

سورۂ محمد، آیت ۷، سورۂ حدید، آیت ۲۵، اور سورۂ حشر آیت ۸ میں گزر چکا ہے، اور ان آیات کی تشریح ہم آل عمران، حاشیہ ۵۰، الحج، حاشیہ ۸۴، سورہ محمد، حاشیہ ۱۲، اور سورۂ حدید، حاشیہ ۴۷ میں کر چکے ہیں، نیز سورۂ محمد، حاشیہ ۹ میں بھی اس مسئلے کے ایک گوشے پر واضح روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگوں کے ذہن میں یہ الجھن پائی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، تمام خلق سے بے نیاز ہے، کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں تو کوئی بندہ آخر اللہ کا مددگار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس الجھن کو رفع کرنے کے لیے ہم یہاں اس مسئلے کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں۔

دراصل ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ اللہ رب العالمین معاذ اللہ کسی کام کے لیے اپنی کسی مخلوق کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت کی آزادی بخشی ہے اس میں وہ لوگوں کو اپنی قوت قاہرہ سے کام لے کر بجبر مومن و مطیع نہیں بناتا بلکہ اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے ان کو راہ راست دکھانے کے لیے تذکیر و تعلیم اور تفہیم و تلقین کا طریقہ اختیار فرماتا ہے۔ اس تذکیر و تعلیم کو جو شخص برضا و رغبت قبول کر لے وہ مومن ہے، جو عملاً مطیعِ فرمان بن جائے وہ مسلم و قانت اور عابد ہے، جو خدا ترسی کا رویہ اختیار کر لے وہ متقی ہے، جو نیکیوں کی طرف سبقت کرنے لگے وہ محسن ہے، اور اس سے مزید ایک قدم آگے بڑھ کر جو اسی تذکیر و تعلیم کے ذریعہ سے بندگان خدا کی اصلاح کے لیے اور کفر و فسق کی جگہ اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کرنے کے لیے کام کرنے لگے اسے اللہ تعالیٰ خود اپنا مددگار قرار دیتا ہے، جیسا کہ آیاتِ مذکورۂ بالا میں کئی جگہ بالفاظِ صریح ارشاد ہوا ہے۔ اگر اصل مقصود اللہ کا نہیں بلکہ اللہ کی دین کا مددگار کہنا ہوتا تو اَنْصَارُ اللّٰهِ کے بجائے اَنْصَارُ دِیْنِ اللّٰهِ فرمایا جاتا، یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ کے بجائے یَنْصُرُوْنَ دِیْنَ اللّٰهِ فرمایا جاتا، اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ کے بجائے اِنْ تَنْصُرُوْا دِیْنَ اللّٰهِ فرمایا جاتا۔ جب ایک مضمون کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے کئی مقامات پر ایک ہی طرز بیان اختیار فرمایا ہے تو یہ اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ اصل مقصود ایسے لوگوں کو اللہ کا مددگار ہی کہنا ہے۔ مگر یہ "مددگاری" نعوذ باللہ اس معنی میں نہیں ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کوئی ضرورت پوری کرتے ہیں جس کے لیے وہ ان کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اس معنی میں ہے کہ یہ لوگ اُسی کام میں حصہ لیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنی قوتِ قاہرہ کے ذریعہ سے کرنے کے بجائے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتا ہے۔

[۲۱] مسیح کو نہ ماننے والے یہودی ہیں اور ان کو ماننے والے عیسائی بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسیح کے منکرین پر غلبہ عطا فرمایا۔ اس بات کو یہاں بیان کرنے سے مقصود مسلمانوں کو یہ یقین دلانا ہے کہ جس طرح پہلے حضرت عیسیٰ کے ماننے والے ان کا انکار کرنے والوں پر غالب آ چکے ہیں، اسی طرح اب محمد ﷺ کے ماننے والے آپ کا انکار کرنے والوں پر غالب آئیں گے۔

اَلْجُمُعَة

نام

آیت ۹ کے فقرے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ اِس سورہ میں نماز جمعہ کے احکام بھی بیان کیے گئے ہیں، لیکن ''جمعہ'' بحیثیت مجموعی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ دوسری سورتوں کے ناموں کی طرح یہ نام بھی علامت ہی کے طور پر ہے۔

زمانۂ نزول

پہلے رکوع کا زمانۂ نزول ۷ ھ ہے، اور غالباً یہ فتح خیبر کے موقع پر یا اس کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوا ہے۔

دوسرا رکوع ہجرت کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے مدینۂ طیبہ پہنچتے ہی پانچویں روز جمعہ قائم کر دیا تھا، اور اِس رکوع کی آخری آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اقامتِ جمعہ کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد لازماً کسی ایسے زمانے ہی میں پیش آیا ہوگا جب لوگوں کو دینی اجتماعات کے آداب کی پوری تربیت ابھی نہیں ملی تھی۔

موضوع اور مضامین

جیسا کہ اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں، اِس سورہ کے دو رکوع دو الگ زمانوں میں نازل ہوئے ہیں۔ اسی لیے دونوں کے موضوع الگ ہیں اور مخاطب بھی الگ۔

پہلا رکوع اُس وقت نازل ہوا جب یہودیوں کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں جو اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے پچھلے چھ سال کے دوران میں انہوں نے کی تھیں۔ اِن آیات کے نزول کے وقت {ان کا سب سے بڑا گڑھ} بھی بغیر کسی غیر معمولی زحمت کے فتح ہو گیا۔ اِس آخری شکست کے بعد عرب میں یہودی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ وادی القریٰ، فدک، تیما، تبوک، سب ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے چلے گئے، یہاں تک کہ عرب کے تمام یہودی اسلام کی رعایا بن کر رہ گئے۔ یہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے اِس سورہ میں ایک مرتبہ پھر اُن کو خطاب فرمایا،

اور غالباً یہ آخری خطاب تھا جو قرآن مجید میں ان سے کیا گیا۔ اِس میں انہیں مخاطب کر کے تین باتیں فرمائی گئی ہیں:

(۱) تم نے اس رسول کو اس لیے ماننے سے انکار کیا کہ یہ اُس قوم میں مبعوث ہوا تھا جسے تم حقارت کے ساتھ ''اُمّی'' کہتے ہو۔ تمہارا زعم باطل یہ تھا کہ رسول لازماً تمہاری اپنی قوم ہی کا ہونا چاہیے۔ {اور یہ کہ} ''امّیوں'' میں کبھی کوئی رسول نہیں آ سکتا۔ لیکن اللہ نے انہی اُمیوں میں سے ایک رسول اٹھایا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے اُس کی کتاب سنا رہا ہے، نفوس کا تزکیہ کر رہا ہے، اور اُن لوگوں کو ہدایت دے رہا ہے جن کی گمراہی کا حال تم خود بھی جانتے ہو۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے۔

(۲) تم کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا، مگر تم نے اس کی ذمہ داری نہ سمجھی، نہ ادا کی۔ {یہاں تک کہ تم} دانستہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اور اس پر تمہارا زعم یہ ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور رسالت کی نعمت ہمیشہ کے لیے تمہارے نام لکھ دی گئی ہے۔

(۳) تم اگر واقعی اللہ کے چہیتے ہوتے اور تمہیں اگر یقین ہوتا کہ اُس کے ہاں تمہارے لیے بڑی عزت اور قدر و منزلت کا مقام محفوظ ہے تو تمہیں موت کا ایسا خوف نہ ہوتا کہ ذلت کی زندگی قبول ہے مگر موت کسی طرح قبول نہیں۔ تمہاری یہ حالت آپ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے کرتوتوں سے تم خود واقف ہو، اور تمہارا ضمیر خوب جانتا ہے کہ ان کرتوتوں کے ساتھ مرو گے تو اللہ کے ہاں اُس سے زیادہ ذلیل و خوار ہو گے جتنے دنیا میں ہو رہے ہو۔

دوسرا رکوع اِس سورہ میں لا کر اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سبت کے مقابلے میں مسلمانوں کو جمعہ عطا فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرمانا چاہتا ہے کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو یہودیوں نے سبت کے ساتھ کیا تھا۔ یہ رکوع اُس وقت نازل ہوا تھا جب مدینے میں ایک روز عین نماز جمعہ کے وقت ایک تجارتی قافلہ آیا اور اس کے ڈھول تاشوں کی آواز سن کر ۱۲ آدمیوں کے سوا تمام حاضرین مسجد نبوی سے قافلے کی طرف دوڑ گئے، حالانکہ اُس وقت رسول اللہ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اس پر یہ حکم دیا گیا کہ جمعہ کی اذان ہونے کے بعد ہر قسم کی خرید و فروخت اور ہر دوسری مصروفیت حرام ہے۔

اٰیَاتُھَا ۱۱ (۶۲) سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ مَدَنِیَّۃٌ (۱۱۰) رُکُوْعَاتُھَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے ــــ بادشاہ ہے نہایت مقدس، زبردست اور حکیم [۱]

وہی ہے جس نے اُمّیوں [۲] کے اندر ایک رسولؐ خود اُنہی میں سے اٹھایا، جو اُنھیں اُس کی آیات سناتا ہے،

[۱] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفسیر سورۂ حدید، حواشی ۱، ۲۔ الحشر، حواشی ۳۶، ۳۷، ۴۱۔ آگے کے مضمون سے یہ تمہید بڑی گہری مناسبت رکھتی ہے۔ عرب کے یہودی رسول اللہ ﷺ کی ذات وصفات اور کارناموں میں رسالت کی صریح نشانیاں بچشم سر دیکھ لینے کے باوجود، صرف اِس بنا پر آپ کا انکار کر رہے تھے کہ اپنی قوم اور نسل سے باہر کے کسی شخص کی رسالت مان لینا انہیں سخت ناگوار تھا۔ آگے کی آیتوں میں اِسی رویہ پر انہیں ملامت کی جا رہی ہے، اس لیے کلام کا آغاز اس تمہیدی فقرے سے کیا گیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ یعنی یہ پوری کائنات اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ اُن تمام نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جن کی بنا پر یہودیوں نے اپنی نسلی برتری کا تصور قائم کر رکھا ہے۔ اپنی ساری مخلوق کے ساتھ اس کا معاملہ یکساں عدل اور رحمت اور ربوبیت کا ہے۔ کوئی خاص نسل اور قوم اُس کی چہیتی نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ کرے، بہر حال اس کی نوازشیں اُسی کے لیے مخصوص رہیں، پھر فرمایا گیا کہ وہ بادشاہ ہے، یعنی دنیا کی کوئی طاقت اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی نہیں ہے۔ تم بندے اور رعیت ہو۔ تمہارا یہ منصب کب سے ہو گیا کہ تم یہ طے کرو کہ وہ تمہاری ہدایت کے لیے اپنا پیغمبر کسے بنائے اور کسے نہ بنائے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ قدوس ہے۔ یعنی اِس سے بدرجہا منزّہ اور پاک ہے کہ اُس کے فیصلے میں کسی خطا اور غلطی کا امکان ہو۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی دو مزید صفتیں بیان فرمائی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ زبردست ہے، یعنی اس سے لڑ کر کوئی جیت نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے، یعنی جو کچھ کرتا ہے وہ عین مقتضائے دانش ہوتا ہے، اور اس کی تدبیریں ایسی محکم ہوتی ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کا توڑ نہیں کر سکتا۔

[۲] یہاں اُمّی کا لفظ یہودی اصطلاح کے طور پر آیا ہے، اور اس میں ایک لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن عربوں کو یہودی حقارت کے ساتھ اُمی کہتے ہیں اور اپنے مقابلہ میں ذلیل سمجھتے ہیں، اُنہی میں اللہ غالب و دانا نے ایک رسول اٹھایا ہے۔ وہ خود نہیں اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ اس کا اٹھانے والا وہ ہے جو کائنات کا بادشاہ ہے، زبردست اور حکیم ہے، جس کی قوت سے لڑ کر یہ لوگ اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے، اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں ''اُمی'' کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ اس کے معنی ایک ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع پر وہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ {یہاں} یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر {آیا} ہے جس سے مراد دنیا کے تمام غیر یہودی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، آل عمران، حاشیہ ۶۴)

اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۴﴾

اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے،[۳] حالاں کہ اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔[۴] اور (اس رسولؐ کی بعثت) اُن دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی اُن سے نہیں ملے ہیں۔[۵] اللہ زبردست اور حکیم ہے۔[۶] یہ اس کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ جن لوگوں کو توراۃ

[۳] قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات چار مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔ {سورہ بقرہ آیت ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران آیت ۱۶۴ سورہ جمعہ کی یہ آیت} ہر جگہ ان {صفات} کے بیان کرنے کی غرض مختلف ہے۔ {یہاں اس کا} سے مقصود یہودیوں کو یہ بتانا ہے کہ محمد ﷺ تمہاری آنکھوں کے سامنے جو کام کر رہے ہیں وہ صریحاً ایک رسول کا کام ہے۔ وہ اللہ کی آیات سنا رہے ہیں جن کی زبان، مضامین، اندازِ بیان، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ فی الواقع وہ اللہ ہی کی آیات ہیں۔ وہ لوگوں کی زندگیاں سنوار رہے ہیں، اور ان کو اعلیٰ درجے کے اخلاقی فضائل سے آراستہ کر رہے ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو اس سے پہلے تمام انبیاء کرتے رہے ہیں۔ پھر وہ ہر وقت اپنے قول اور عمل سے اور اپنی زندگی کے نمونے سے لوگوں کو کتابِ الٰہی کا منشا سمجھا رہے ہیں اور اُن کو اُس حکمت و دانائی کی تعلیم دے رہے ہیں جو انبیاء کے سوا آج تک کسی نے نہیں دیے یہی سیرت اور کردار اور کام ہی تو انبیاء کا وہ نمایاں وصف ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی ہٹ دھرمی ہے کہ جس کا رسولِ برحق ہونا اُس کے کارناموں سے علانیہ ثابت ہو رہا ہے اس کو ماننے سے تم نے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اللہ نے اسے تمہاری قوم کے بجائے اُس قوم میں سے اٹھایا جسے تم اُمی کہتے ہو۔

[۴] یعنی تمہارے سامنے وہ حالت بھی ہے جس میں یہ {اہل عرب} اسلام قبول کرنے سے پہلے مبتلا تھے۔ وہ حالت بھی ہے جو اسلام لانے کے بعد ان کی ہوگئی، اور اسی قوم کے اُن لوگوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو جنہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے۔ کیا یہ کھلا کھلا فرق، جسے ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کے سوا کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا؟

[۵] یعنی محمد ﷺ کی رسالت صرف عرب قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی اُن دوسری قوموں اور نسلوں کے لیے بھی ہے جو ابھی آ کر اہل ایمان میں شامل نہیں ہوئی ہیں مگر آگے قیامت تک آنے والی ہیں۔ یہ آیت منجملہ اُن آیات کے ہے جن میں تصریح کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہے اور ابد تک کے لیے ہے۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات جہاں اس مضمون کی صراحت کی گئی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفسیر سورۂ سبا، حاشیہ ۴۷)۔

[۶] یعنی یہ اُسی کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایسی ناتراشیدہ اُمی قوم میں اس نے ایسا عظیم نبی پیدا کیا جس کی تعلیم و ہدایت اِس درجہ انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر ابدی اصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوعِ انسانی مل کر ایک امت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اُصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رونما ہوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے اُس کے لیے انتخاب کیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ
اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ

کا حامل بنایا گیا تھا مگر اُنہوں نے اُس کا بار نہ اٹھایا۔[۷] اُن کی مثال اُس گدھے[۸] کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اِس سے بھی زیادہ بری مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے۔[۹] ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اِن سے کہو، ''اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو،[۱۰] اگر تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ باقی سب لوگوں کو چھوڑ کر

[۷] اس فقرے کے دو معنی ہیں۔ ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر توراۃ کے علم و عمل، اور اس کے مطابق دنیا کی ہدایت کا بار رکھا گیا تھا، مگر نہ انہوں نے اپنی اس ذمہ داری کو سمجھا اور نہ اس کا حق ادا کیا۔ خاص معنی یہ ہیں کہ حامل توراۃ گروہ ہونے کی حیثیت سے جن کا کام یہ تھا کہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اُس رسول کا ساتھ دیتے جس کے آنے کی صاف صاف بشارت توراۃ میں دی گئی تھی، مگر انہوں نے سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور توراۃ کی تعلیم کے تقاضے کو پورا نہ کیا۔

[۸] یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور ان سے کیا چاہتی ہے۔

[۹] یعنی ان کا حال گدھے سے بھی بدتر ہے۔ وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا اس لیے معذور ہے۔ مگر یہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ توراۃ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اس کے معنی سے ناواقف نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ اس کی ہدایات سے دانستہ انحراف کر رہے ہیں، اور اُس نبی کو ماننے سے قصداً انکار کر رہے ہیں جو توراۃ کی رُو سے سراسر حق پر ہے۔ یہ نافہمی کے قصوروار نہیں ہیں بلکہ جان بوجھ کر اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے مجرم ہیں۔

[۱۰] یہ نکتہ قابل توجہ ہے۔ ''اَے یہودیو'' نہیں کہا ہے بلکہ ''اَے وہ لوگو جو یہودی بن گئے ہو'' یا ''جنہوں نے یہودیت اختیار کر لی ہے'' فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل دین جو موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا۔ ان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا، اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اِس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اُس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات و نظریات اور رُجحانات کے مطابق عقائد اور رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے۔ اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو اَلَّذِيْنَ هَادُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی ''اَے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو۔'' ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے، بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں ''اے بنی اسرائیل'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں اَلَّذِيْنَ هَادُوْا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۶
وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۷
قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ
ع ۸/۱۱ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ ع يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى

بس تم ہی اللہ کے چہیتے[۱۱] ہو تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے اِس زعم میں سچے ہو۔"[۱۲] لیکن یہ ہرگز اُس کی تمنا نہ کریں گے اپنے اُن کرتوتوں کی وجہ سے جو یہ کر چکے ہیں،[۱۳] اور اللہ اِن ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اِن سے کہو، "جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تو تمہیں آ کر رہے گی۔ پھر تم اُس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے، اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔" ع

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن[۱۴] تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور

[۱۱] قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اُن کے اس دعوے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو (البقرہ:۱۱۱) (البقرہ:۸۰، آل عمران:۲۴) (المائدہ:۱۸)

[۱۲] یہ بات پہلے سورۂ بقرہ آیات (۹۴، ۹۶) میں فرمائی گئی تھی۔ پھر یہاں دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض تکرار نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ والی آیات میں یہ بات اُس وقت کہی گئی تھی جب یہودیوں سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہ ہوئی تھی۔ اور اِس سورۃ میں اس کا اعادہ اُس وقت کیا گیا ہے جب ان کے ساتھ متعدد معرکے پیش آنے کے بعد عرب میں آخری اور قطعی طور پر ان کا زور توڑ دیا گیا۔ اِن معرکوں نے، اور ان کے اس انجام نے وہ بات تجربے اور مشاہدے سے ثابت کر دی جو پہلے سورۂ بقرہ میں کہی گئی تھی۔ عرب کے یہودی اپنی تعداد اور طاقت میں مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھے، اور وسائل کے لحاظ سے بہت بڑھ چڑھ کر تھے۔ لیکن جس چیز نے اِس نامساوی مقابلے میں مسلمانوں کو غالب اور یہودیوں کو مغلوب کیا وہ یہ تھی کہ مسلمان راہِ خدا میں مرنے سے خائف تو درکنار، تہ دل سے اُس کے مشتاق تھے اور سر ہتھیلی پر لیے ہوئے میدانِ جنگ میں اُترتے تھے۔ اِس کے برعکس یہودیوں کا حال یہ تھا کہ وہ کسی راہ میں بھی جان دینے کے لیے تیار نہ تھے، نہ خدا کی راہ میں، نہ قوم کی راہ میں، نہ خود اپنی جان اور مال اور عزت کی راہ میں۔ انہیں صرف زندگی درکار تھی، خواہ وہ کیسی ہی زندگی ہو۔ اسی چیز نے ان کو بزدل بنا دیا تھا۔

[۱۳] بالفاظِ دیگر وہ زبان سے خواہ کیسے ہی لمبے چوڑے دعوے کریں، مگر ان کے ضمیر خوب جانتے ہیں کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہے، اور آخرت میں اس کے کیا نتائج نکلنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے ان کا نفس خدا کی عدالت کا سامنا کرنے سے جی چراتا ہے۔

[۱۴] اِس فقرے میں تین باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں نماز کے لیے منادی کرنے کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی ایسی نماز کی منادی کا ذکر ہے جو خاص طور پر صرف جمعہ کے دن ہی پڑھی جانی چاہیے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں چیزوں کا ذکر اس

ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹ فَاِذَا

خرید و فروخت چھوڑ دو،[۱۵] یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب

طرح نہیں کیا گیا ہے کہ تم نماز کے لیے منادی کرو، اور جمعہ کے روز ایک خاص نماز پڑھا کرو، بلکہ اندازِ بیان اور سیاق وسباق صاف بتا رہا ہے کہ نماز کی منادی اور جمعہ کی مخصوص نماز، دونوں پہلے سے جاری تھیں، البتہ لوگ یہ غلطی کر رہے تھے کہ جمعہ کی منادی سن کر نماز کے لیے دوڑنے میں تساہل برتتے تھے اور خرید وفروخت کرنے میں لگے رہتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت صرف اس غرض کے لیے نازل فرمائی کہ لوگ اس منادی اور اس خاص نماز کی اہمیت محسوس کریں اور فرض جان کر اس کی طرف دوڑیں۔ ان تینوں باتوں پر اگر غور کیا جائے تو ان سے یہ اصولی حقیقت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو کچھ ایسے احکام بھی دیتا تھا جو قرآن میں نازل نہیں ہوئے، اور وہ احکام بھی اُسی طرح واجب الاطاعت تھے جس طرح قرآن میں نازل ہونے والے احکام۔ نماز کی منادی وہی اذان ہے جو آج ساری دنیا میں ہر روز پانچ وقت ہر مسجد میں دی جا رہی ہے۔ مگر قرآن میں کسی جگہ نہ اس کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں، نہ کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو اس طرح پکارا کرو۔ یہ چیز رسول اللہ ﷺ کی مقرر کردہ ہے۔ قرآن میں دو جگہ صرف اُس کی توثیق کی گئی ہے، ایک اِس آیت میں، دوسرے سورۂ مائدہ کی آیت ۵۸ میں۔ اِسی طرح جمعہ کی یہ خاص نماز جو آج ساری دنیا کے مسلمان ادا کر رہے ہیں، اس کا بھی قرآن میں نہ حکم دیا گیا ہے نہ وقت اور طریقِ ادا بتایا گیا ہے۔ یہ طریقہ بھی رسول اکرم ﷺ کا جاری کردہ ہے، اور قرآن کی یہ آیت صرف اُس کی اہمیت اور اس کے وجوب کی شدت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس صریح دلیل کے باوجود جو شخص یہ کہتا ہے کہ شرعی احکام صرف وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ دراصل سنت کا نہیں، خود قرآن کا منکر ہے۔

جمعہ دراصل ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب اسے یوم عروبہ کہا کرتے تھے۔ اسلام میں جب اس کو مسلمانوں کے اجتماع کا دن قرار دیا گیا تو اس کا نام جمعہ رکھا گیا۔

-اسلام سے پہلے ہفتہ کا ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کرنے اور اس کو شعارِ ملت قرار دینے کا طریقہ اہل کتاب میں موجود تھا۔ یہودیوں کے ہاں اس غرض کے لیے سبت (ہفتہ) کا دن مقرر کیا گیا تھا، عیسائیوں نے اپنے آپ کو یہودیوں سے ممیز کرنے کے لیے اپنا شعارِ ملت اتوار کا دن قرار دیا۔ اسلام نے ان دونوں ملتوں سے اپنی ملت کو ممیز کرنے کے لیے یہ دونوں دن چھوڑ کر جمعہ کو اجتماعی عبادت کے لیے اختیار کیا۔

[۱۵] اس حکم میں ذکر سے مراد خطبہ ہے، کیونکہ اذان کے بعد پہلا عمل جو نبی ﷺ کرتے تھے وہ نماز نہیں بلکہ خطبہ تھا، اور نماز آپ ہمیشہ خطبہ کے بعد ادا فرماتے تھے۔ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ذکر سے مراد یا تو خطبہ ہے یا پھر خطبہ اور نماز دونوں۔

خطبہ کے لیے ''ذکر اللہ'' کا لفظ استعمال کرنا خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس میں وہ مضامین ہونے چاہییں جو اللہ کی یاد سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اسی بنا پر زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ خطبہ میں ظالم حکمرانوں کی مدح وثنا، یا ان کا نام لینا اور ان کے لیے دعا کرنا، ذکر اللہ سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ تو ذکر الشیطان ہے۔

''اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھاگتے ہوئے آؤ بل کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جلدی سے جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔ مفسرین نے بھی بالاتفاق اس کو اہتمام کے معنی میں لیا ہے، ان کے نزدیک سعی یہ ہے کہ آدمی اذان کی آواز سن کر فوراً مسجد پہنچنے کی فکر میں لگ جائے۔ اور معاملہ اتنا ہی نہیں ہے۔ حدیث میں بھاگ کر نماز کے لیے آنے کی صاف صاف ممانعت وارد ہوئی ہے۔

قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ
لَهْوَا ۨ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ
اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ ع ۲ ۳ ۱۲

نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔[۱۶] اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو،[۱۷] شاید کہ تمہیں فلاح نصیب[۱۸] ہو جائے۔

اور جب اُنہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اُس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا۔[۱۹] اِن سے کہو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔[۲۰] اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ ع[۲۱]

''خرید و فروخت چھوڑ دو'' کا مطلب صرف خرید و فروخت ہی چھوڑنا نہیں ہے، بلکہ نماز کے لیے جانے کی فکر اور اہتمام کے سوا ہر دوسری مصروفیت چھوڑ دینا ہے۔ بیع کا ذکر خاص طور پر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جمعہ { کا دن وہاں خرید و فروخت کا خاص دن ہوتا تھا} لیکن ممانعت کا حکم صرف بیع تک محدود نہیں ہے، بلکہ دوسرے تمام مشاغل بھی اس کے تحت آ جاتے ہیں، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف ان سے منع فرما دیا ہے، اس لیے فقہاء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد بیع اور ہر قسم کا کاروبار حرام ہے۔

یہ حکم قطعی طور پر نماز جمعہ کے فرض ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ البتہ حضورؐ نے عورت، بچے، غلام، مریض اور مسافر کو اس فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

[۱۶] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جانا اور تلاش رزق کی دوڑ دھوپ میں لگ جانا ضروری ہے۔ بلکہ یہ ارشاد اجازت کے معنی میں ہے۔ چونکہ جمعہ کی اذان سن کر سب کاروبار چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا تھا اس لیے فرمایا گیا کہ نماز ختم ہو جانے کے بعد تمہیں اجازت ہے کہ منتشر ہو جاؤ اور اپنے جو کاروبار بھی کرنا چاہو کرو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حالت اِحرام میں شکار کی ممانعت کرنے کے بعد فرمایا وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (المائدہ:۲) ''جب تم احرام کھول چکو تو شکار کرو۔'' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احرام کھولنے کے بعد ضرور شکار کرو۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد شکار پر کوئی پابندی باقی نہیں رہتی۔ چاہو تو شکار کر سکتے ہو۔

لہٰذا جو لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے اسلام میں جمعہ کی چھٹی نہیں ہے وہ غلط کہتے ہیں۔ اگر ہفتہ میں کوئی ایک دن عام تعطیل کے لیے مقرر کرنا ایک تمدنی ضرورت ہو تو جس طرح یہودی اس کے لیے فطری طور پر ہفتے کو اور عیسائی اتوار کو منتخب کرتے ہیں اسی طرح مسلمان لازماً اس غرض کے لیے جمعہ ہی کو منتخب کرے گا۔

[۱۷] یعنی اپنے کاروبار میں لگ کر بھی اللہ کو بھولو نہیں، بلکہ ہر حال میں اس کو یاد رکھو اور اس کا ذکر کرتے رہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفسیر سورۂ اَحزاب، حاشیہ ۶۳)

[۱۸] اس طرح کے مواقع پر شاید کا لفظ استعمال کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ کوئی شک لاحق ہے، بلکہ یہ دراصل شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مہربان آقا اپنے ملازم سے کہے کہ تم فلاں خدمت انجام دو، شاید کہ تمہیں ترقی مل

جائے۔ اس میں ایک لطیف وعدہ پوشیدہ ہوتا ہے جس کی امید میں ملازم دل لگا کر بڑے شوق کے ساتھ وہ خدمت انجام دیتا ہے۔

[۱۹] یہ ہے وہ واقعہ جس کی وجہ سے اُوپر کی آیات میں جمعہ کے احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ مدینہ طیبہ میں شام سے ایک تجارتی قافلہ عین نمازِ جمعہ کے وقت آیا اور اس نے ڈھول تاشے بجانے شروع کیے تاکہ بستی کے لوگوں کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ اُس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ڈھول تاشوں کی آوازیں سن کر لوگ بے چین ہو گئے اور ۱۲ آدمیوں کے سوا باقی سب بقیع کی طرف دوڑ گئے جہاں قافلہ اُترا ہوا تھا۔ اس {صورت حال کی رونما ہو جانے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ابھی مدینے کا ابتدائی زمانہ تھا}

اُس وقت ایک طرف تو صحابہ کی اجتماعی تربیت ابتدائی مراحل میں تھی۔ اور دوسری طرف کفارِ مکہ نے اپنے اثر سے مدینہ طیبہ کے باشندوں کی سخت معاشی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس کی وجہ سے مدینے میں اشیائے ضرورت کمیاب ہو گئی تھیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ اُس وقت مدینے میں لوگ بھوکوں مر رہے تھے اور قیمتیں بہت چڑھی ہوئی تھیں (ابن جریر) اس حالت میں جب ایک تجارتی قافلہ آیا تو لوگ اس اندیشے سے کہ کہیں ہمارے نماز سے فارغ ہوتے ہوتے سامان فروخت نہ ہو جائے، گھبرا کر اس کی طرف دوڑ گئے۔ یہ ایک ایسی کمزوری اور غلطی تھی جو اس وقت اچانک تربیت کی کمی اور حالات کی سختی کے باعث رونما ہو گئی تھی۔

[۲۰] یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ صحابہ سے جو غلطی ہوئی تھی اس کی نوعیت کیا تھی۔ اگر معاذ اللہ اس کی وجہ ایمان کی کمی اور آخرت پر دنیا کی دانستہ ترجیح ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب اور زجر و توبیخ کا انداز کچھ اور ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی خرابی وہاں نہ تھی، بلکہ جو کچھ ہوا تھا تربیت کی کمی کے باعث ہوا تھا، اس لیے پہلے معلمانہ انداز میں جمعہ کے آداب بتائے گئے، پھر اُس غلطی پر گرفت کر کے مربیانہ انداز میں سمجھایا گیا کہ جمعہ کا خطبہ سننے اور اس کی نماز ادا کرنے پر جو کچھ تمہیں خدا کے ہاں ملے گا وہ اِس دنیا کی تجارت اور کھیل تماشوں سے بہتر ہے۔

[۲۱] یعنی اِس دنیا میں مجازاً جو بھی رزق رسانی کا ذریعہ بنتے ہیں ان سب سے بہتر رازق اللہ تعالیٰ ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْن

نام

پہلی آیت کے فقرہ اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اس سورۃ کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں منافقین ہی کے طرزِ عمل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول

یہ سورۃ غزوۂ بنی المصطلق سے (جو ۶ھ میں واقع ہوا تھا) رسول اللہ ﷺ کی واپسی پر یا تو دوران سفر میں نازل ہوئی ہے، یا حضورؐ کے مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اس کا نزول ہوا ہے۔

تاریخی پس منظر

جس خاص واقعہ کے بارے میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مدینے کے منافقین کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ جو واقعہ اُس موقع پر پیش آیا تھا وہ محض ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ اُس کے پیچھے ایک پورا سلسلۂ واقعات تھا جو بالآخر اِس نوبت تک پہنچا۔ مدینۂ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اَوس اور خزرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر {قبیلۂ خزرج کے رئیس عبداللہ بن ابی بن سلول} کی قیادت و سیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کر دیں، حتیٰ کہ اس کے لیے تاج بنا بھی لیا گیا تھا۔

اس صورتِ حال میں اسلام کا چرچا مدینے پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے بااثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔

جب حضورؐ مدینے پہنچے تو انصار کے ہر گھرانے میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبی بے بس ہو گیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ حالانکہ اس کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اُس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔

جنگِ بدر کے بعد جب یہود بنی قینقاع کی صریح بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ ﷺ نے اُن پر چڑھائی کی تو یہ شخص اُن کی حمایت پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ (ابن ہشام، ج ۳، ص ۵۱، ۵۲)

جنگِ اُحد کے موقع پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے اُلٹا واپس آ گیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور رسول اللہ ﷺ ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔ اِن ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضورؐ کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

پھر ۴ھ میں غزوہ بنی النَّضیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ {یہ تھا وہ پس منظر جس کے ساتھ وہ اور اس کے ساتھی منافقین غزوہ بنی المصطلق میں شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر} انہوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اٹھا دیے جو مسلمانوں کی جمعیت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے۔ مگر قرآنِ پاک کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے اہل ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی اُس کی بدولت اِن دونوں فتنوں کا بروقت قلع قمع ہو گیا اور یہ منافقین اُلٹے خود ہی رُسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ اور دوسرا فتنہ یہ ہے کہ جس کا اِس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کی {مختصر تفصیل یہ ہے کہ} بنی المصطلق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکرِ اسلام اُس بستی میں ٹھیرا ہوا تھا جو مریسیع نامی کنویں پر آباد تھی کہ یکا یک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا نام جہجاہ بن مسعود غفاری تھا جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور اُن کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اور دوسرے صاحب سنان بن وَبرا الجہنی تھے جن کا قبیلہ خزرج کے ایک قبیلے کا حلیف تھا زبانی ترش کلامی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی اور جہجاہ نے سنان کے ایک لات رسید کی جسے اپنی قدیم یمنی روایات کی بنا پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے۔ اس پر سنان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا، اور جہجاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابن اُبی نے اِس جھگڑے کی خبر سنتے ہی اَوس اور خزرج کے لوگوں کو بھڑکانا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ اُدھر سے کچھ مہاجرین بھی نکل آئے تو قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی اور اُسی جگہ انصار و مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے اور اُسے شکست دے کر ابھی اُسی کے علاقے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ شور سن کر رسول اللہ ﷺ نکل آئے اور آپ نے فرمایا **مابالُ دعوی الجاهلية؟ مالكم ولدعوة الجاهلية؟ دعوها فانها مُنتِنة**۔ ''یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں اور یہ جاہلیت کی پکار کہاں؟ اِسے چھوڑ دو، یہ بڑی گندی چیز ہے''۔ اس پر دونوں طرف کے صالح لوگوں نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور سنان نے جہجاہ کو معاف کر کے صلح کر لی۔

اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں نفاق تھا عبداللہ بن اُبی کے پاس پہنچا اور ان لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ ''اب تک تو تم سے امیدیں وابستہ تھیں اور تم مدافعت کر رہے تھے، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلہ میں اِن کنگلوں کے مددگار بن گئے ہو۔'' ابن اُبی پہلے ہی کھول رہا تھا۔ اِن باتوں سے وہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا ''یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے اِن لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، ان پر اپنے مال تقسیم کیے، یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر خود ہمارے ہی حریف بن گئے۔ ہماری اور اِن قریش کے کنگلوں (یا اصحاب محمدؐ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرتا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم، مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔''

{حضورؐ کو جب اس بات کا علم ہوا تو} آپ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا، حالانکہ حضورؐ کے معمول کے لحاظ سے وہ کوچ کا وقت نہ تھا۔ مسلسل ۳۰ گھنٹے چلتے رہے یہاں تک کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے۔ پھر آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تھکے ہوئے لوگ زمین پر کمر ٹکاتے ہی سو گئے۔ یہ آپ نے اس لیے کیا کہ جو کچھ مریسیع کے کنوئیں پر پیش آیا تھا اس کے اثرات لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائیں۔ {لیکن} رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابن اُبی کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابن اُبی سے کہا جا کر رسول اللہ ﷺ سے معافی مانگو۔ مگر اس نے تڑخ کر جواب دیا ''تم نے کہا کہ اُن پر ایمان لاؤ۔ میں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دے دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمدؐ کو سجدہ کروں۔'' ان باتوں سے اس کے خلاف مومنین انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اُس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینۂ طیبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن اُبی کے صاحبزادے، جن کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، تلوار سونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے، ''آپ نے کہا تھا کہ مدینہ واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا، اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔ خدا کی قسم، آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ ﷺ آپ کو اجازت نہ دیں۔'' اس پر ابن اُبی چیخ اُٹھا ''خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔'' لوگوں نے یہ خبر حضورؐ تک پہنچائی اور آپ نے فرمایا ''عبداللہ سے کہو، اپنے باپ کو گھر آنے دے۔'' عبداللہؓ نے کہا ''اُن کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں۔''

یہ تھے وہ حالات جن میں یہ سورت، اغلب یہ ہے کہ حضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔

اٰیَاتُھَا ۱۱ (۶۳) سُوْرَۃُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِیَّۃٌ (۱۰۴) رُکُوْعَاتُھَا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْٓا وقف لازم
اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

اَے نبیؐ، جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔“ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔[۱] انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے[۲] اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے اور دنیا کو روکتے ہیں۔[۳] کیسی بری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

[۱] یعنی جو بات وہ زبان سے کہہ رہے ہیں وہ ہے تو بجائے خود سچی، لیکن چونکہ اُن کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جسے وہ زبان سے ظاہر کر رہے ہیں، اس لیے اپنے اِس قول میں وہ جھوٹے ہیں کہ وہ آپ کے رسول ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔

[۲] یعنی اپنے مسلمان اور مومن ہونے کا یقین دلانے کے لیے جو قسمیں وہ کھاتے ہیں، اُن سے وہ ڈھال کا کام لیتے ہیں تا کہ مسلمانوں کے غصے سے بچے رہیں اور ان کے ساتھ مسلمان وہ برتاؤ نہ کر سکیں جو کھلے کھلے دشمنوں سے کیا جاتا ہے۔

اِن قسموں سے مراد وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو وہ بالعموم اپنے ایمان کا یقین دلانے کے لیے کھایا کرتے تھے، اور وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو اپنی کسی منافقانہ حرکت کے پکڑے جانے پر وہ کھاتے تھے تا کہ مسلمانوں کو یہ یقین دلائیں کہ وہ حرکت انہوں نے منافقت کی بنا پر نہیں کی تھی، اور وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو عبداللہ بن اُبی نے حضرت زید بن اَرقم کی دی ہوئی خبر کو جھٹلانے کے لیے کھائی تھیں۔ اِن سب احتمالات کے ساتھ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس قول کو قسم قرار دیا ہو کہ ”ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔“

[۳] صد کا لفظ عربی زبان میں لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اس لیے صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ اس راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ترجمہ میں دونوں معنی درج کر دیے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی ان قسموں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی جگہ محفوظ کر لینے کے بعد وہ اپنے لیے ایمان کے تقاضے پورے نہ کرنے اور خدا اور رسول کی اطاعت سے پہلو تہی کرنے کی آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن جھوٹی قسموں کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، اسلام سے غیر مسلموں کو بدگمان کرنے اور سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں شبہات اور وسوسے ڈالنے کے لیے وہ وہ حربے استعمال کرتے ہیں جو صرف ایک مسلمان بنا ہوا منافق ہی استعمال کر سکتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳
وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اِن لوگوں نے ایمان لا کر پھر کفر کیا اِس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔[۴]

اِنھیں دیکھو تو اِن کے جُثے تمھیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ[۵] جاؤ۔ مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیے گئے ہوں۔[۶] ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔[۷] یہ پکے دشمن ہیں،[۸]

[۴] اس آیت میں ایمان لانے سے مراد ایمان کا اقرار کر کے مسلمانوں میں شامل ہونا ہے۔ اور کفر کرنے سے مراد دل سے ایمان نہ لانا اور اُسی کفر پر قائم رہنا ہے جس پر وہ اپنے ظاہری اقرارِ ایمان سے پہلے قائم تھے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ جب انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر سیدھے سیدھے ایمان یا صاف صاف کفر کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے یہ منافقانہ روش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور ان سے یہ توفیق سلب کر لی گئی کہ وہ ایک سچے اور بے لاگ اور شریف انسان کا سا رویہ اختیار کریں۔

یہ آیت من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اللہ کی طرف سے کسی کے دل پر مہر لگانے کا مطلب بالکل واضح طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان منافقین کی یہ حالت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تھی اس لیے ایمان ان کے اندر اُتر ہی نہ سکا اور وہ مجبوراً منافق بن کر رہ گئے۔ بلکہ اس نے ان کے دلوں پر یہ مہر اس وقت لگائی جب انہوں نے اظہارِ ایمان کرنے کے باوجود کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب ان سے مخلصانہ ایمان کی توفیق سلب کر لی گئی اور اُسی منافقت کی توفیق انہیں دے دی گئی جسے انہوں نے خود اختیار کیا تھا۔

[۵] حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبی بڑے ڈیل ڈول کا، تندرست، خوش شکل اور چرب زبان آدمی تھا۔ اور یہی شان اس کے بہت سے ساتھیوں کی تھی۔ یہ سب مدینہ کے رئیس لوگ تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آتے تو دیواروں سے تکیے لگا کر بیٹھتے اور بڑی لچھے دار باتیں کرتے۔

[۶] یعنی جو دیواروں کے ساتھ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، یہ انسان نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے کندے ہیں۔ اُن کو لکڑی سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا کہ یہ اخلاق کی رُوح سے خالی ہیں جو اصل جوہرِ انسانیت ہے۔ پھر انہیں دیوار سے لگے ہوئے کندوں سے تشبیہ دے کر یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ بالکل ناکارہ ہیں۔ کیونکہ لکڑی بھی اگر کوئی فائدہ دیتی ہے تو اُس وقت جبکہ وہ کسی چھت میں، یا کسی دروازے میں، یا کسی فرنیچر میں لگ کر استعمال ہو رہی ہو۔ دیوار سے لگا کر کندے کی شکل میں جو لکڑی رکھ دی گئی ہو وہ کوئی فائدہ بھی نہیں دیتی۔

[۷] یعنی چونکہ وہ اپنے دلوں میں خوب جانتے تھے کہ وہ ایمان کے ظاہری پردے کی آڑ میں منافقت کا کیا کھیل کھیل رہے ہیں، اس لیے انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب ان کے جرائم کا راز فاش ہو جائے، بستی میں کسی طرف سے بھی کوئی زور کی آواز آتی یا کہیں کوئی شور بلند ہوتا تھا تو وہ سہم جاتے اور یہ خیال کرتے تھے کہ آ گئی ہماری شامت۔

[۸] دوسرے الفاظ میں کھلے دشمنوں کی بہ نسبت یہ چھپے ہوئے دشمن زیادہ خطرناک ہیں۔

فَاحْذَرْهُمْ ؕ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ
مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ
يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۶﴾ هُمُ الَّذِيْنَ
يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ

اِن سے بچ کر رہو،[۹] اللہ کی مار اِن پر،[۱۰] یہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں۔[۱۱]

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ اللہ کا رسولؐ تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے، تو سر جھٹکتے ہیں، اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رُکتے ہیں۔[۱۲] اَے نبیؐ، تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دُعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے، اللہ ہرگز انھیں معاف نہ کرے گا،[۱۳] اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا۔[۱۴] یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسولؐ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تا کہ یہ منتشر ہو جائیں۔

[۹] یعنی ان کے ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ ہر وقت خیال رکھو کہ یہ کسی وقت بھی دغا دے سکتے ہیں۔

[۱۰] یہ بددعا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں اِس فیصلے کا اعلان ہے کہ وہ اس کی مار کے مستحق ہو چکے ہیں، ان پر اس کی مار پڑ کر رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے لغوی معنی میں استعمال نہ فرمائے ہوں بلکہ عربی محاورے کے مطابق لعنت اور پھٹکار اور مذمت کے لیے استعمال کیے ہوں۔

[۱۱] یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کو ایمان سے نفاق کی طرف اُلٹا پھرانے والا کون ہے۔ اس کی تصریح نہ کرنے سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اُن کی اِس اُوندھی چال کا کوئی ایک محرک نہیں ہے بلکہ بہت سے محرکات اس میں کارفرما ہیں۔ شیطان ہے۔ برے دوست ہیں۔ ان کے اپنے نفس کی اغراض ہیں۔ کسی کی بیوی اس کی محرک ہے۔ کسی کے بچے اس کے محرک ہیں۔ کسی کی برادری کے اَشرار اس کے محرک ہیں۔ کسی کو حسد اور بغض اور تکبر نے اس راہ پر ہانک دیا ہے۔

[۱۲] یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ رسول کے پاس استغفار کے لیے نہ آئیں، بلکہ یہ بات سن کر غرور اور تمکنت کے ساتھ سر کو جھٹکا دیتے ہیں اور رسول کے پاس آنے اور معافی طلب کرنے کو اپنی توہین سمجھ کر اپنی جگہ جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ان کے مومن نہ ہونے کی کھلی علامت ہے۔

[۱۳] یہ بات سورۂ توبہ میں (جو سورۂ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے) اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ {ملاحظہ ہو سورہ توبہ کی آیت ۸۰ اور آیت ۸۴}۔

[۱۴] اس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو